مجید امجد کی نظم میں ڈرامائی عناصر کا رجحان

ڈاکٹر ارم صبا

Dr. Irum Saba

Department of Urdu,

Federal Urdu University, Islamabad.

Abstract:

Majeed Amjad's poetry shows an amazing breadth of content ranging from personal love to the special problems facing an emerging Pakistan. His poems are colorful canvases portraying his age and his unique views of the people and places he lived. His first collection of poetry Shab e Rafta was published in 1958. His second collection of poetry "Shab e Rafta kay baad" published after his death. A sense of melancholy pervades Amjad,spoetry. He seems to be intensely lonely, perhaps his poems were his constant companions because he likes to work and rework his compositions, never ready to let go of them, part with them.

مجید امجد کی نظم کو کسی ایک تحریک یا رجحان کی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے شاعری کا آغاز کیا تو ایک طرف ترقی پسند تحریک کے تحت فن کی مقصدیت کو سامنے لایا جا رہا تھا اور دوسری طرف حلقہ اربابِ ذوق کے تحت ہیّت کے تجربات اور نفسیات سے مدد لی جا رہی تھی۔ مگر مجید امجد کسی ایک تحریک کے شاعر نہیں تھے۔ مجید امجد کے ہاں دونوں تحریکوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں ان اثرات کے باوجود مجید امجد نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔

مجید امجد زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ وہ خود کو ایک عام انسان سمجھتے تھے اور عام انسانوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک کہانی بیان کر رہے ہیں۔ اس کہانی میں مختلف کردار ہوتے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا حقیقی واقعات سے بنا گیا ہے۔ کہانی، واقعات، کردار اور کرداروں کے مکالمات کی وجہ سے نظم کی فضا ڈرامائی ہو جاتی ہے۔ ''دستک''، ''اچھوت''، ''ماں کا تصور''، ''خدا''، ''جہانِ قیصر و جم''، ''ایک پر نشاط جلوس کے ساتھ''، ''خودکشی''، ''پنواڑی''، ''زندگی اے زندگی''، ''آٹو گراف''، ''کہانی ایک ملک کی''، ''بس اسٹینڈ پر''، اور ''پکار'' وغیرہ میں ہمیں مختلف کہانیاں نظر آتی ہیں۔ مجید امجد کی نظموں میں اصل زندگی کے کردار نظر آتے ہیں۔ اور ان کرداوں کے گرد بنی کہانی میں ہمیں افسانے کا رنگ نظر آتا ہے۔ مجید امجد کی نظموں کے اس ڈرامائی پہلو کے متعلق یحییٰ امجد لکھتے ہیں:

''مجید امجد کی نظموں میں افسانے ہیں، لیکن دراصل یہ پروازِ تخیل نہیں بلکہ حقیقی واقعات

ہیں۔جنھیں انھوں نے افسانوی شکل دی ہے۔ان سب کی فضا پراسرار، گہری اور جذباتی ہے۔دیکھنے میں تو یہ واقعات کسی مخصوص وقت میں پیش آئے لیکن جیسا انھوں نے انھیں بیان کیا وہ اپنے تعینات سے اچھل کر زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔جیسے ازل اور ابد کی اتھری لہروں پر قید رہے ہوں۔کہیں کہیں مکالمے ہیں اور ڈرامے کی شکل بن جاتے ہیں اور کہیں افسانے۔'' (۱)

نظم ''آٹو گراف'' بظاہر ایک خارجی واقعہ ہے جو حقیقت بھی ہو سکتا ہے شاعر نے حقیقت میں افسانے کی آمیزش کر دی۔نظم کے پہلے منظر میں مجید امجد کرکٹ سٹیڈیم کے باہر کا منظر دکھاتے ہیں۔باہر حسین لڑکیاں ہاتھوں میں آٹو گراف بک لے کر کھڑی ہیں۔دوسرے منظر میں کھیل کے ختم ہوتے ہی تماشائی گیٹ سے باہر نکلتے ہیں۔باہر کھڑی حسین لڑکیاں کھلاڑیوں کی جانب آٹو گراف کے لیے لپکتی ہیں۔مجید امجد خوب صورتی سے اس منظر کو نظم میں قید کرتے ہیں:

وہ باؤلر اک مہوشوں کے جمگھٹوں میں کھو گیا
وہ صفحۂ بیاض پر
بصد غرور کلک گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری (۲)

نظم کے آخری منظر میں شاعر کے المیے کا آغاز ہوتا ہے۔لوگ کھلاڑیوں کی طرف اشتیاق سے بڑھتے ہیں مگر شاعروں کی کوئی قدر نہیں۔نظم کے موضوع ''فنِ ناشناسی'' جو اس دور کا المیہ ہے۔شاعر نے اس موضوع کو ڈرامائی عناصر پلاٹ، کردار، منظر نگاری کی مدد سے کامیابی سے بیان کیا ہے۔

مجید امجد کی اکثر نظموں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ان میں کوئی کہانی کہی جا رہی ہو۔اس کہانی میں در آنے والے مکالمات کی وجہ سے نظم کی فضا ڈرامائی ہو جاتی ہے۔ان کہانیوں میں ہزاروں کردار بھی ہیں مرکزی کردار خود مجید امجد کا ہے۔مجید امجد گرد و پیش کی زندگی کے واقعات، ہنگاموں اور عام مناظر سے اپنی نظم کا خمیر تیار کرتے ہیں۔عام شخص کی نگاہ میں جو چیز سادہ اور بے رنگ ہوتی ہے مجید امجد کو انھی اشیا میں تازگی اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''مجید امجد کی نظموں میں قریبی اشیاء کے وجود کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ممٹیاں، کلس، گلیاں، بس اسٹینڈ، پان، چائے کی پتی، دھوپ رچے کھیت، آنگن، نالیاں اور اس طرح کی ان گنت اشیاء جو شاعر کے ماحول کا حصہ ہیں بڑی آہستگی سے اس کے کلام میں ابھرتی چلی آئی ہیں۔شاعر کا مشاہدہ بڑا گہرا ہے اور اس کی نظر سے ماحول کا کوئی نوکیلا پہلو اوجھل نہیں۔تاہم مجید امجد کا یہ مشاہدہ محض خارجی ماحول کی تصویر کشی تک محدود نہیں یہ سارا ماحول اور اس کی اشیا شاعر کے تجربے کی چکا چوند سے اکتسابِ نور بھی کرتی ہیں۔'' (۳)

نظم ''موانست'' کا آغاز کسی پراسرار داستان کی طرح ہوتا ہے۔رات کے وقت شاعر گھر سے نکلا ہے۔اس کی آہٹ سے کوئل چونک کر جاگ جاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ یہ تو وہی شاعر ہے جو صبح روز ادھر سے گزرتا ہے:

رات اچانک پھاٹک کا اک پہیہ رینگا

پگڈنڈی پر اک آہٹ نے ٹھوکر کھائی
کالے کالے پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ کندھے جھٹک کے چونکی، چیخی
جیسے کوئی اس کی طرف جھپٹا ہو
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا
اوہو یہ تو وہی سایہ تھا
جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز ادھر سے گزرتا ہے اور پہلی کرن کی پینگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس باڑی میں کھو جاتا ہے
آج تو جانے کس لرزاں دھبے سے ٹکرایا ''وہ پگلا''
کوئل نے یہ سوچا(۴)

نظم ''پھولوں کی پلٹن'' میں شاعر بچپن کی داستان سناتا ہے۔ آج کے بچے جن سہولتوں سے بہرہ ور ہیں بچپن میں ہم ان سے محروم تھے۔ پہلے منظر میں شاعر نے بچوں کو گھروں سے نکل کر سکول جاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بچوں نے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ شاعر نے بچوں کو اکٹھے فرش پر چلتے ہوئے دیکھا تو ہمیں باور کروایا کہ وہ اس دور کی کہانی سنانے والا ہے جب یہ فرش نئے تھے۔ ماضی کی داستان سنا کر شاعر حال میں واپس آجاتا ہے اور بچوں سے مخاطب ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں جن پر تم اس وقت چل رہے ہو۔ نظم میں اقتصادی ناہمواری کے خلاف ردِعمل بھی موجود ہے۔ نظم کے پہلے منظر میں مجید امجد اسکول کے بچوں کو بھاری بستے اٹھائے اسکول جاتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ اسکول کے راستے میں ایک امیر آدمی جو اوورکوٹ پہنے ہوئے ہے، بچوں سے پوچھتا ہے ''تمھیں سردی نہیں لگتی؟'' شاعر نے نظم میں طبقاتی بُعد اور اقتصادی ناہمواری کی تصویر کشی خوب صورت انداز میں کی ہے۔ بچہ زندگی کا بھاری بستہ لیے ہوئے اس امیر آدمی کو جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کرتا ہے ''نہیں تو کیسی سردی؟ ہم کو تو نہیں لگتی۔'' شاعر نظم میں مختلف مناظر دکھاتا ہے پہلا منظر حال کا ہے جب شاعر بچوں کو اپنی کہانی سناتا ہے۔ پھر وہ ماضی میں جھانکتا ہے۔ تیسرے منظر میں ماضی کی داستان دہرا کر شاعر حال میں پلٹ آتا ہے اور بچوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

بچو! ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں، جن پر تم چلتے ہو
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمھاری اک اک صف کی وردی
اک نئی تقدیر کا پہناوا ہے
اُجلے اُجلے پھولوں کی پلٹن پہ چلنے والو!
تمھیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے اب وہ لوگ ہیں
جن کا بچپن ان خوابوں میں گزرا تھا، جو آج تمھاری زندگیاں ہیں (۵)

مجید امجد کی کہانیوں میں ہزاروں کردار ہیں۔ مجید امجد متحرک تصویریں بناتے ہیں اور لوگوں کے ہجوم کو، درختوں

چڑیوں کو،شہر،گلیاں ، بازاروں،موٹر ڈیلروں غرض ساری چیزوں کی جزئیات اور تفصیلات کو ویڈیو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ان کی نظموں میں تصویریں بہت واضح ہیں۔وہ ہر چیز کی تفصیل بیان کرتے ہیں ہر چیز کی تفصیل جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں کوئی بھی چیز فالتو محسوس نہیں ہوتی۔ یہ تصاویر ساکت و جامد نہیں ہیں۔ان میں آواز،حرکت اور حرارت شامل ہے۔ انھی تصویروں میں ایک مکمل تصویر''پنواڑی'' کی ہے۔نظم کے آغاز میں بوڑھے پنواڑی کا حلیہ اور اس کی دکان کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ ڈرامے کا پہلا ایکٹ ہے۔جس میں مرکزی کردار کی شباہت اور اس کا تعارف اس کی دکان کے منظر کا بیان ہے۔اس کے ساتھ ہی شاعر نے وہ منظر بھی دکھایا ہے جو نظم کے آخر میں المیاتی فضا پیدا کرے گا۔''آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاڑی''،نظم کے اگلے ایکٹ میں بوڑھے پنواڑی کی موت اور آخری ایکٹ میں اس موت سے پیدا ہونے والے المیے کو پیش کیا گیا ہے۔

نظم کے آغاز میں بوڑھا پنواڑی اپنی دکان پر بیٹھا ہے۔شاعر کیمرہ اس کی دکان کے اندر لے جاتا ہے اور دکان کا اندرونی منظر دکھاتا ہے۔دکان کے اندر ایک شکستہ الماری پڑی ہے جس میں پان،سگریٹ،تمباکو،چونا اور لونگ سپاری ہے جو پنواڑی کی کل کائنات ہے۔ساری عمر یہ بوڑھا پنواڑی کولہو کے بیل کی طرح گھر سے دکان اور دکان سے گھر کی طرف رواں دواں رہا:

عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے چھالیا کاٹتے ، کتھا پگھلاتے گزری
سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری(۶)

مجید امجد نے پنواڑی کی محدود کائنات کا منظر تفصیل سے دکھایا ہے۔نظم کے تیسرے منظر میں شاعر افسانے کو اختتام تک پہنچا دیتا ہے۔ پنواڑی مر جاتا ہے لیکن کاروبارِ زندگی اسی طرح چلتا رہتا ہے۔منظر میں صرف اتنی تبدیلی آتی ہے کہ اب پنواڑی کی جگہ اس کا بالا دکان سنبھال لیتا ہے:

کون اس گتھی کو سلجھائے دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں ، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو ، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی ، بابا اللہ بیلی
صبح بھجن کی تار منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کم سن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن ، ٹھن ٹھن ، چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے ، دوسرا آئے(۷)

مجید امجد عام انسان کی باتیں کرتے ہیں۔ مجید امجد ایسے انسان کی نمائندگی کرتے ہیں جو معاشی اور سیاسی اقدار کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے یہ انسان غربت، پسماندگی اور ناانصافی جیسے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ یہ انسان معاشی عدم مساوات اور طبقاتی نظام کا شکار ہے۔ بقول یحیٰ امجد:

''مجید امجد کی شاعری کا مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے کو اور اس سے بھی نیچے کی زندگی کو دیکھتا ہے مگر اوپر کھڑے ہو کر نہیں، شفقت اور مربیانہ مہربانی سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ خود کو اس کا حصّہ محسوس کرتا ہے۔''(۸)

نظم ''جلوسِ جہاں'' ڈرامائی نظم ہے۔ مختصر سی نظم میں شاعر نے دو مناظر دکھائے ہیں۔ دونوں مناظر میں دو مختلف رویے دکھائے گئے ہیں اور آخر میں شاعر نے نظم سے نتیجہ نکالا کہ لوگ اپنی غرض کے لیے نرم یا سخت رویہ استعمال کرتے ہیں۔ نظم کے پہلے منظر میں شاعر اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو بیان کرتا ہے:

''میں پیدل تھا میرے قریب آ کر اس نے بہ پاسِ ادب اپنے تانگے کو روکا۔ اچانک جو بجریلی پٹڑی پہ سم کھڑکھڑائے، سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھسل کر جو ٹھہری تو میں نے سنا ایک خاکستری نرم لہجے میں، مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا چلیں گے کہیں آپ؟۔۔۔۔۔۔بازار، منڈی، سٹیشن، کچہری پلٹ کر جو دیکھا تو تانگے پہ کوئی سواری نہ تھی، فقط اک فرشتہ پھٹے کپڑے پہنے، عنانِ دو عالم کو تھامے ہوئے تھا۔ میں پیدل تھا اتنے میں کڑکا کوئی تازیانہ، بہا فرشِ آہن پر ٹاپوں کا سرپٹ تریڑا کوئی تند لہجے میں گرجا ''ہٹو سامنے سے'' اور پُرشور پہیے گھنا گھن مری سمت جھپٹے، بمشکل سنبھل کر جو دیکھا، کھچا کھچ بھرے تیز تانگے کی مسند پر، اک صورت سگ لجام فرش پر جھکی تھی۔''(۹)

دوسرے منظر میں شاعر دوسرا واقعہ بیان کرتا ہے اور پھر دونوں واقعات سے منطقی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری جیسے ڈرامائی عناصر نے نظم کو پُر تاثیر اور خوب صورت بنا دیا ہے۔ کردار اور مکالے کی ڈرامائی تکنیک مجید امجد کی نظموں میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ نظم ''بس اسٹینڈ'' میں کردار ہیں۔ کرداروں کے مکالموں سے نظم ترتیب پاتی ہے۔ نظم کا پہلا کردار خدا سے فریاد کرتا ہے ''خدایا! اب کہ یہ کیسی بہار آئی'' دوسرا کردار خدا سے شکایت کی نفی کرتا ہے جب کہ تیسرا کردار انسان کے طرزِ زندگی اور طرزِ احساس پر دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ نظم کا چوتھا کردار پُر امید ہے کہ نظام بدلنے والا ہے:

ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
بسے گی اک نئی دنیا، سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں، گلستاں میں نیا موسم
وہ رُت اے ہم نفس! جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی(۱۰)

نظم ''قیصریت'' اپنے زمانے کی تصویر بناتی ہے اس تصویر پر سامراجی قوتوں کے استحصالی رویے کے واضح چھینٹے نظر آتے ہیں۔نظم میں ایک سپاہی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔سپاہی جنگ کے لیے روانہ ہورہا ہے۔جاتے جاتے اپنے بیٹے کو پیار کرتا ہے اور کہتا ہے:

چوم کر اس کے گلابی گال کو
جاتے دم کہتا تھا اپنے لال کو
دیکھتی ہے راستہ امی تری
جاؤ بیٹا! جاؤ! میں آیا ابھی(۱۱)

سپاہی جنگ میں مارا جاتا ہے اوراس کی بیوہ دوسری شادی کرلیتی ہے۔سپاہی کا اکلوتا یتیم بیٹا دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور بالآخر بھیک مانگنے کے لیے بادشاہ کے محل جاتا ہے:

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم
آنکھ گریاں،روح لرزاں،دل دونیم
بادشاہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پہ کوڑے مار کر
پہرہ داروں نے کہا دھتکار کر
کیا تیرے مرنے کی باری آ گئی
دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی
وہ مڑا چکرایا اور اوندھا گرا
گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے
''بادشاہ مہرباں! زندہ رہے''(۱۲)

نظم میں ڈرامے کے تمام عناصر موجود ہیں۔مجید امجد نے ڈرامائی عناصر کا سہارا لے کر سامراجی قوتوں کو نشانہ بنایا ہے انھیں معلوم تھا کہ معاشرے میں کیڑے مکوڑے جیسی رعایا کے اوپر بے شمار قیصر،کسریٰ اور جمشید مختلف صورتوں میں موجود تھے۔جن کی حکمرانی کی سفاکی سے مجید امجد آگاہ تھے۔

''کہانی ایک ملک کی'' کا پہلا منظر روایتی سیاست دانوں کی زندگی کے پہلو کو سامنے لاتا ہے۔اس منظر میں راج محل اور راجا کے ساتھ ساتھ یہاں میراثی،چپڑاسی اور ماجھے گامے سب موجود ہیں:

راج محل کے دروازے پر/آکر رکی اک کار
پہلے نکلا بھدا،بے ڈھب،بودا/میل کچیل کا تودا
حقہ تھامے اک میراثی

عمر اس کی کوئی اسی بیاسی
پیچھے اس کا نائب، تمبا کو بردار
باہر رینگے اس کے بعد قطار/عنبر دار/نمبر دار
ساتھ سب ان کے دم چھلے/ ایم ایل اے
جہل بھرے علامے/ ماجھے، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ میں شہد۔۔۔۔۔اور جیب میں چاقو
نسلِ ہلاکو(۱۳)

راج محل اس سوچ اور اس نظام کی علامت ہے جو صدیوں سے انسان پر مسلط ہے اور اس کے اطوار نہ کبھی بدلے ہیں اور نہ بدلیں گے۔ نظم کے آخر میں منظر بدلتا ہے یہ راج محل کے باہر کا منظر ہے۔ مجید امجد راج محل کے باہر کی دنیا کا اندر کی دنیا سے موازنہ کرتا ہے۔ باہر کی دنیا میں وہ محنت کش ہے جو اپنے سینے میں فولادی دل رکھتا ہے:

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پیئیں اور پھول کھلا ہیں(۱۴)

نظم ''طلوعِ فرض'' ایک ڈرامائی نظم ہے۔ شاعر نظم میں مختلف مناظر پیش کرتا ہے۔ پہلا منظر صبح کا منظر ہے۔ ہر کوئی مصروف اور جلدی میں ہے:

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں
سرِ بازار انسانوں کا انبوہ
کسی دست گل اندوہ حنا ہوں(۱۵)

دفتر کے راستے میں شاعر کئی مناظر دیکھتا جاتا ہے۔ صبح کے اس منظر میں طرح طرح کے لوگ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ کہیں حنائی ہاتھ ہیں تو کہیں محنت کش کے ہاتھوں کی خراشیں ہیں اور کہیں کوئی بھکارن دامن پھیلائے ہے:

وہ اک اندھی بھکارن لڑکھڑائی

کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے
صدا سے راہ گیروں کو جھکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا، میلا میلا دامن
یہ کاسہ، یہ گلوئے شور انگیز
میرا دفتر، میری مسلیں، میرا میز
ابھی کم سن ہے اس کو کیا پڑی ہے
جسے جزداں بھی اک بارِ گراں ہے
وہ بچہ بھی سوئے مکتب رواں ہے(۱۶)

مجید امجد کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے۔ وطن کی طرف بڑھتے دشمن کے ناپاک قدم دیکھ کر مجید امجد تڑپ اٹھتے ہیں۔ وطن کے دولخت ہو جانے پر وہ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے کسی نے انھیں دولخت کر دیا ہو۔ نظم ''ریڈیو پر ایک قیدی'' میں وہ قیدی کی کیفیت کو خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

ریڈیو پر ایک قیدی مجھ سے کہتا ہے: ''میں زندہ ہوں''
سنتے ہو۔۔۔۔۔ میں زندہ ہوں
بھائی۔۔۔۔۔۔۔۔تو یہ کس سے مخاطب ہے؟
ہم کب زندہ ہیں
اپنی اس چمکیلی زندگی کے لیے
تیری مقدس زندگی کا ہوں سودا کر کے(۱۷)

نظم ''خدا (ایک اچھوت ماں کا تصور)'' میں مجید امجد کردار نگاری سے کام لیتے ہیں۔ ماں اپنے ننھے بیٹے رلدو سے مخاطب ہے اور اسے بتاتی ہے کہ تیرا بھگوان پرمیشر اس دنیا کا پالن ہار ہے اور وہ آکاش کے پیچھے رہتا ہے۔ نظم ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' میں مجید امجد اپنی کہانی سناتے ہیں:

کیا کہوں کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے
یہ مرا قصّہ غم کون سنے/کس کو سناؤں۔۔۔۔۔کس کو
اپنے احساس کا جلتا ہوا زہر۔۔۔۔۔ پلاؤں کس کو(۱۸)

مجید امجد کے ہاں موضوعاتی حوالے معنوی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے عصری صورتِ حال پر نظر کی ہے بلکہ ان کی نظموں میں آنے والے دنوں کا حوالہ بھی موضوع بنتا ہے۔ مجید امجد کائنات کے ذرے ذرے سے محبت کرتے ہیں۔ کائنات کے متعلق ان کا مشاہدہ عقلی اور منطقی نظریے کے تابع ہے۔ ان کی نظموں میں سائنسی شعور سماجی حوالوں کے ساتھ

موجود ہے۔نظم ''۲۴۹۲ کا جنگی پوسٹر'' سائنسی شعور کے مستقبل پر مبنی ایک خوب صورت نظم ہے:

اک محافظ ستارے نے کل شام کرۂ ارض کو خبر دی ہے
ملکِ مریخ کے لٹیروں نے وادیٔ مہ تباہ کر دی ہے
جادۂ کہکشاں کے دونوں طرف گھاٹی گھاٹی لہو سے بھر دی ہے
آج انھوں نے نظامِ عالم کو دعوتِ آتش و شرر دی ہے
آن پہنچی ہے امتحاں کی گھڑی خاکیو وقت پائے مردی ہے
یہ تمھی نے ہی بزمِ انجم کو تابشِ سلک صد گہر دی ہے
یہ تمھی نے متاعِ نور اپنی مشتری کو بھی مشت بھر دی ہے
آج تقدیرِ زندگی نے صدا پھر تمھیں نوبتِ دگر دی ہے
آب اور گِل کے اک کھلونے کو شانِ دارائی بشر دی ہے
پھاند جاؤ حدیں زمانوں کی تھام لو باگ آسمانوں کی(۱۹)

مجید امجد کی اکثر نظموں میں کردار، مکالمے اور مناظر کی بدولت ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔نظم اور ڈرامے کا یہ حسین امتزاج مجید امجد کی شعری اسلوب کا نمایاں وصف ہے بقول حرم علیم:

''وہ(مجید امجد) افسانے اور ڈرامے کی عجیب کیفیات کو متصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ان نظموں میں ایک عجیب سنگم، ایک عجیب امتزاج افسانے اور ڈرامے کی تاثیر کا ہے۔مجید امجد کی نظموں میں یوں بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے تو ایک کہانی کو نظم میں لکھا، پھر شعری وسائل سے کام لیتے ہوئے اس کی ڈرامائی کیفیات کو ابھارا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظموں میں کہانی لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور ہدایات کو بھی خود بناتے چلے جاتے ہیں۔''(۲۰)

حوالہ جات

۱۔ یحییٰ امجد،مضمون: پاکستانی عوامی ادبی کلچر کا پیش رو،مشمولہ: مجید امجد ایک مطالعہ،مرتب:حکمت ادیب، جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی، باراوّل، ۱۹۹۴ء،ص:۱۳۲

۲۔ محمد زکریا،خواجہ،ڈاکٹر،مدون ومحقق،کلیاتِ مجید امجد، دہلی: فرید بک ڈپو،۲۰۱۱ء،ص:۱۵۳

۳۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،نظم جدید کی کروٹیں، لاہور: مکتبہ میری لائبریری،۱۹۷۴ء،ص:۴۹

۴۔ محمد زکریا،خواجہ،ڈاکٹر،مدون،کلیاتِ مجید امجد، دہلی: فرید بک ڈپو،۲۰۱۱ء،ص:۴۸۵

۵۔ ایضاً،ص:۴۹۶

۶۔ ایضاً،ص:۸۸

۷۔ ایضاً،ص:۸۹

۸۔ یحیٰی امجد،مضمون: پاکستانی عوامی ادبی کلچر کا پیش رو،مشمولہ: مجید امجد ایک مطالعہ ص:۲۶۳

۹۔ محمد زکریا،خواجہ،ڈاکٹر،مدون: کلیاتِ مجید امجد،ص:۴۲۴

۱۰۔ ایضاً،ص:۱۵۳

۱۱۔ ایضاً،ص:۲۲۸

۱۲۔ ایضاً،ص:۲۲۹

۱۳۔ ایضاً،ص:۳۰۶

۱۴۔ ایضاً،ص:۳۰۷

۱۵۔ ایضاً،ص:۷۴

۱۶۔ ایضاً،ص۷۵

۱۷۔ ایضاً،ص:۳۷۴

۱۸۔ ایضاً،ص:۲۸۶

۱۹۔ ایضاً،ص:۶۵

۲۰۔ خرم علیم، مجید امجد کی نظموں میں افسانوی عناصر،مطبوعہ: زرنگار،شمارہ ۳۔۴،۲۰۱۰ء،ص:۱۶۹

☆......☆......☆